محمد حنیف ندوی

تعلیماتِ غزالی

تلاوت و قرأت قرآن کے باطنی پہلو

قرآنِ حکیم کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل دس پہلو ایسے ہیں کہ جن کا سمجھ لینا نہایت ضروری ہے :

۱۔ اصل کلام کی حقیقت
۲۔ تعظیم و توقیر کے تقاضے
۳۔ حضورِ قلب
۴۔ تدبّر
۵۔ تفہم
۶۔ موانع فہم سے دست کشی
۷۔ تخصیص
۸۔ تاثر
۹۔ ترقی
۱۰۔ تبری

اب ان پہلوؤں کی تفصیلات ملاحظہ ہوں :

جہاں تک اصل کلام کی حقیقت کا تعلق ہے، سب سے اہم اور قابلِ غور بات یہ ہے کہ کیونکر اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم نے یہ گوارا فرمایا کہ مفہوم و معنی کی تجلّیات بلند سے نیچے اُتر کر بندوں سے ہمکلام ہوا اور اپنی صفت کلام کو کہ جو ازل سے اس کے ساتھ وابستہ ہے اور نہایت لطیف و نازک الفاظ و حروف کا جامہ پہنائے۔ اس کرم و لطف بے نہایت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اگر انسان چاہتا کہ اپنی عقل و زیرکی سے اس کی صفات کے بارہ میں علم حاصل کرے اور فکر و دانش کی پرواز سے اس کے حریمِ ناز تک پہنچے۔ تو اس کو اس میں قطعی کامیابی نہ ہو پاتی اور کسی طرح بھی اس کے کلام و منشا تک اس کی رسائی نہ ہو پاتی۔ یہ تو محض اس کا فضل بے حد اور فیض غیر محدود ہے کہ اس نے اپنے کلام کے انوار

کو الفاظ و کلمات کی صورت میں ظاہر فرمایا اور اس کامیابی کے ساتھ کہ عامی سے عامی بھی اس کی حکمتوں کو پا لینے پر نازاں ہے۔ اور یہ اُسی کا کام ہے کہ بندوں کو قرب و اتصال کے ان درجات پر فائز کرے اور ان مراتب کا اہل قرار دے۔ ورنہ کیا یہ ممکن تھا کہ طور ایسا پہاڑ تو ریزہ ریزہ ہو جائے اور اس کے تجلّیات گونا گوں کا تحمل نہ کر سکے اور موسیٰ کا ضعیف و ناتوان قلب و جگر نہ صرف اس کو برداشت ہی کرے بلکہ ان سے بہرہ مند بھی ہو۔

اللہ کے اس لطف و کرم کی نوعیت کو سمجھنے کے لئے کہ جس نے باوجود اپنے درجات کی بلندیوں کے اپنی صفات کی تنزیہہ کے اپنے بندوں کو شرفِ تخاطب سے مشرف فرمایا۔ اور ان میں یہ اہلیت پیدا کی کہ اس کے اُس کلام لطیف کو سمجھ سکیں کہ جو حروف و الفاظ کی منت کشی سے یکسر آزاد ہے۔ ایک حکیم کی اس مثال کو سامنے رکھئے۔ اس سے اس کے انداز کرم اور اسلوب لطف کی کچھ تصویر ذہن کی گرفت میں آسکے گی۔ مثال یہ ہے کہ جب آپ کا سابقہ بعض حیوانات سے ہو یا طیور اور پرندوں سے ہو۔ آپ ان کو پالنا چاہتے ہوں اور اپنے ہاں گھروں میں رکھنا چاہتے ہوں تو ان کو سدھانے اور بعض حرکات و اشارات سمجھانے میں کیا اصول مفید رہتا ہے؟ یا کیا طریق اختیار کیا جاتا ہے یہی نا کہ آپ اپنے مرتبہ کا خیال کئے بغیر ان کی سطح پر آجاتے ہیں۔ اور عجیب عجیب حرکات و اشارات کو کام میں لاتے ہیں۔ تب جا کر کہیں وہ اس قابل ہوتے ہیں کہ آپ کے احکام کی پیروی کر سکیں اور آپ کے اشاروں کو سمجھ سکیں۔ بالکل یہی معاملہ اللہ تعالےٰ کا اپنے بندوں کے ساتھ ہے۔ ورنہ اسکی صفت کلام اُس کی تجلیات معنی و منشا کو یہ حیوانِ ناطق کب سمجھ سکتا تھا۔ اور کب اس لائق ہو سکتا تھا کہ آپ سے آپ اس کے احکام کی پیروی کر سکے۔ یہ اس کی مہربانی اور محبت ہے کہ اس نے اپنے مقام جلال سے نیچے اُتر کر الفاظ و حروف کی سطح پر انسان کو خیر و شر کا فلسفہ سمجھایا۔ حالانکہ اس کی ذات اس سطح سے بہت بالا و بلند ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کلام الٰہی بمنزلہ جسد و جسم کے ہے اور معنی و منشا بمنزلہ روح و نفس کے۔ پھر جس طرح ایک جیتے جاگتے جسم کا احترام اس کی زندگی کی بنا پر کیا جاتا ہے اور اُسے شئی زائد سمجھ کر چھوڑ نہیں دیا جاتا۔ اسی طرح کلام الٰہی کا احترام اس کے معنی کے اعتبار سے ضروری ہے۔ یہ ایک تمثیل ہے اس سے بس اتنا ہی سمجھانا مقصود ہے کہ اللہ تعالےٰ کی تجلیات کلامیہ نے انسانی حرف و صوت کا جو لباس اختیار کیا ہے اُس میں اُس کی مہربانی کو خاص دخل ہے۔ کیونکہ اگر اس کی ذاتِ گرامی مہربان نہ ہوتی اور اگر اس کا فیض وجود جوش میں نہ آتا تو اس کی تجرید و درائیت بھی کبھی کسوتِ الفاظ میں متجلی ہونا گوارا نہ کرتی۔

تعظیم و توقیر کے تقاضوں کا مطلب یہ ہے کہ جب قاری قرآنِ حکیم کی تلاوت کرنے لگے تو سب سے پہلے دل میں متکلم کی عظمت کا نقش جمائے۔ اور یہ سمجھے کہ یہ کلام انسانی کلام ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ اس کا تعلق پروردگار عالم سے ہے۔ اس لئے اس کا پڑھنا کسی معمولی کتاب کا پڑھنا نہیں ہے۔ بلکہ صحیفہ خداوندی کا پڑھنا ہے۔ اس تصوّر میں کس درجہ نزاکت ہے اور اس سے تلاوتِ قرآن کا مشغلہ کس درجہ پُرخطر ہو جاتا ہے، اس کو ہر کوئی نہیں جان سکتا۔

لا یمسہ الا المطہرون۔

پھر جس طرح قرآن کے اوراق و حروف کو چھونے کے لئے ضروری ہے کہ چھونے والا پاک ہو اور کسی ظاہر آلائش سے ملوث نہ ہو اسی طرح جو شخص اس کے معانی و مطالب کو پالینا چاہتا ہے اس کے لئے بھی ضروری ہے کہ قلب و نظر کی پاکیزگی کا حامل ہو۔ یعنی جس طرح ہر ہر ہاتھ اس کو چھونے کا استحقاق نہیں رکھتا، اسی طرح ہر ہر ذہن و قلب اس لائق نہیں کہ اس کی گہرائیوں سے تعرض کرے۔ اس کے لئے ایک خاص نوع کی صلاحیتِ فکر، تطہیر باطن اور تعظیم و توقیر کی حاجت ہے۔ تلاوت کے سلسلہ میں یہی وہ نکتہ ہے کہ جس کو سمجھ لینے کے بعد تلاوت کا مرحلہ اس درجہ آسان نہیں رہتا کہ جتنا کہ عوام نے سمجھ رکھا ہے۔ حضرت عکرمہ کے بارہ میں منقول ہے، کہ جونہی ان کا شوقِ تلاوت جوش میں آتا، اور یہ قرآن کو ہاتھ میں لے کر اس کی ورق گردانی شروع کرتے، ان پر غشی طاری ہو جاتی، اور بے اختیار ان کی زبان پر یہ کلمات جاری ہو جاتے:

ھو کلام ربی ھو کلام ربی۔ یہ تو میرے رب کا کلام ہے، یہ تو میرے رب کا کلام ہے

یعنی ان کو اپنی جسارت پر افسوس ہوتا کہ میں نے اپنے محبوب کے پیام و کلام کے ساتھ یہ سرسری معاملہ کیوں روا رکھا۔ متکلم کی عظمت کا نقش دل میں بٹھانے اور جمانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی صفات پر غور کرے اس کے افعال و سنن سے متعلق سوچے اور اس حقیقت کا اقرار کرے کہ عرش و کرسی سے لے کر کائنات کے ادنیٰ ظہورات تک کا وہی خالق ہے، وہی سب کو رزق پہنچانے والا ہے اور سب اسی کے قبضۂ قدرت کے اسیر ہیں۔

حضورِ قلب سے یہ مراد ہے کہ قرآن پڑھتے وقت پوری پوری یکسوئی حاصل ہو اور سوا قرآن کے خیال کے اور کوئی خیال فکر و تدبّر کے واجبات کو اُکسانے والا نہ ہو۔ ایک صاحب سے پوچھا گیا کہ قرآن پڑھتے وقت آپ حدیثِ نفس سے دوچار ہوتے ہیں یا نہیں۔ تو اُنہوں نے کہا۔ یہ کیونکر ممکن ہے۔ کیا قرآن سے بڑھ کر بھی کوئی شے محبوب اور پیاری ہو سکتی ہے۔

سلف میں کے بعض حضرات کا معمول تھا کہ جب قرآن پڑھتے اور اس میں جی نہ لگتا تو پھر بار بار مختلف آیات کی تلاوت کرتے تا آنکہ انس و محبت کے تقاضے بیدار ہو جاتے۔ ایک صاحب نے کیا خوب کہا ہے کہ قرآن میں کیا نہیں ہے! اس میں تق و دق میدان بھی ہیں اور باغات و بستان معانی بھی۔ بالاخانے بھی ہیں اور محبوبانِ دلنواز بھی۔ دیبا و حریر کے پیراہن بھی ہیں اور آراستہ و پیراستہ کمرے اور گوشہ ہائے عزلت بھی۔ چنانچہ میمات تو تق و رق میدان ہیں۔ راءات کا سلسلہ گویا باغات کی ایک قطار ہے۔ حاءات کو بالاخانے سمجھئے۔ اور مسبحات کو محبوبانِ دلنواز قرار دیجئے۔ حامیمات دیبا و حریر کے پیرہن ہیں۔ اور مفصلات گوشہ ہائے عزلت و خلوت کہ جن میں غور و تدبر کی ہزارہا لذتیں پنہاں ہیں۔ اب جس نے ان میدانوں میں قدم دھرا، ان باغات میں گھوما پھرا، اور جوان صاف ستھرے بالاخانوں میں

استراحت پذیر ہوا اور جس نے اپنی آنکھوں سے محبوبانِ دلنواز کو دیکھا۔ دیبا و حریر کے پیراہنوں کو زیب تن کیا۔ اور ان گوشہائے عزلت و حکومت میں رہ کر فکر و تدبّر کی لذتوں سے آشنا ہوا اس کو اس کا یارا کب ہے کہ ادھر اُدھر ذہن کو مشوش کرتا پھرے۔ تدبّر کا رتبہ حضورِ قلب سے آگے کا ہے، حضورِ قلب سے تو صرف اتنا ہی مقصود تھا کہ قاری کا ذہن قرآن کے بارہ میں یکسو ہو۔ تدبّر کا یہ مطلب ہے کہ قاری نہ صرف یکسو ہو بلکہ قرآن کے معانی و مطالب میں غور و فکر بھی کرے۔ اور جو کچھ پڑھ رہا ہے اس کی تہ تک پہنچنے کی کوشش بھی کرے۔ ترتیل و تجوید کے قاعدوں کو اس بناء پر اہمیت دی گئی ہے کہ اس سے فہمِ قرآن میں مدد ملتی ہے۔ حضرت علی کا کہنا ہے:

لاخیر فی عبادۃ لافقہ فیھا ولا قرأۃ لا تدبّر فیھا۔ — اُس عبادت میں خیر کا کوئی پہلو نہیں جس میں فقہ و شعور نہ ہو اور اُس قرأت میں بھلائی کا کوئی سایہ نہیں جو تدبّر سے عاری ہو۔

تدبّر کے دواعی کو بیدار کرنے کا ایک طریق یہ ہے کہ آیات کو بار بار پڑھے۔ اور اس اثناء میں ان کی تہوں میں اُترنے کی جدوجہد کرے۔ لیکن آیات کے اعادے کا یہ طریق اُسی وقت مفید رہے گا جب قاری تنہا نماز پڑھ رہا ہو اور امام کے پیچھے نہ کھڑا ہو۔ کیونکہ اقتداء کی صورت میں اس کی پیروی ضروری ہے۔ اور بار بار پڑھنے اور غور و فکر کو کسی ایک ہی آیت پر مرکوز کرتے میں یہ اندیشہ ہے کہ جب تک وہ کسی ایک آیت پر غور کرے گا اور اس کو اپنے تدبّر کا مدار و محور ٹھہرائے گا امام اس مقام سے آگے گزر جائے گا۔

قرآن میں غور و فکر اگرچہ بجائے خود مقصود و مطلوب ہے مگر نماز باجماعت چونکہ ایک طرح کا نظم چاہتی ہے اسلئے اس میں اگر مبالغہ کی حد تک اس کی اجازت دی جائے گی تو یہ بجائے نیکی کے ایک برائی شمار ہوگا۔ اسی حقیقت کی طرف علمر بن عبد قیس نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ:

الوسواس یعترینی فی الصلوٰۃ۔ — میں نماز میں وسوسوں سے محفوظ نہیں رہ پاتا۔

پوچھا گیا کہ کیسے وسوسے؟ کیا امور دنیا سے متعلق قلب و ذہن کسی طرح کا الجھاؤ محسوس کرتا ہے۔ کہنے لگے جی نہیں۔

لان تختلف فی الاسنۃ احب الی من ذالک ولکن یشتغل قلبی بموقفی بین یدی ربی عزوجل وانی کیف انصرف۔ — میرے جسم پر تیر و سنان کے حملے ہوں یہ تو گوارا ہے مگر یہ گوارا نہیں کہ نماز میں امور دنیا مجھے الجھائیں نہیں۔ وسوسہ یہ ہے کہ نماز باجماعت کے دوران میرا قلب اس احساس میں ڈوب جاتا ہے کہ میں اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہوں۔ اور یہ ایسی کیفیت ہے کہ جس سے ذہن علیحدگی برداشت نہیں کرتا۔

یعنی میں اسی لذت میں مشغول رہتا ہوں اور امام آگے بڑھ جاتا ہے۔

بار بار آیات کے پڑھنے اور دُھرانے کی کیا اہمیت ہے اس کا اندازہ صحابہ و تابعین کے ان اقوال سے لگائیے تمیم الداری رات بھر اس ایک ہی آیت کی تلاوت میں لگے رہے۔

ام حسب الذین اجترحوا السیات۔ (الآیہ)

سعید بن جبر نے اس آیت کی تلاوت میں پوری رات گذار دی:

وامتازوا الیوم ایھا المجرمون۔ (الآیہ)

سلیمان الدارانی کا کہنا ہے۔ کہ چاہے چار پانچ راتیں بیت جائیں میں جب تک ایک آیت میں تدبر نہ کرلیتا اور اس کی کیفیات سے قلب و ذہن کو پوری طرح متاثر نہ کرلیتا دوسری آیت نہ پڑھتا۔

سلف کے ایک بزرگ کے بارہ میں منقول ہے کہ ان کو سورۂ ہود کے مطالب و معانی پر تدبر کرنے میں چھ مہینے صرف کرنے پڑے۔ ایک عارف نے اپنے معمولات کا یوں ذکر کیا ہے۔ کہ میں نے ختم قرآن کی صورتیں مقرر کر رکھی ہیں۔ ایک ختم تو روزانہ ہوتا ہے۔ ایک ہفتہ وار ہوتا ہے۔ ایک ماہ بماہ ہوتا ہے اور ایک پورے سال میں صرف ایک دفعہ۔ تیس برس سے تلاوت و تدبر کا یہ عمل جاری ہے۔ مگر نہیں کہہ سکتا کہ اس کے تمام معانی کے احاطہ سے فراغت حاصل کرچکا ہوں۔ اس کی توجیہ انہوں نے یہ بیان کی کہ میری حیثیت قرآن کے ایک مزدور کی ہے۔ جو اس میں محنت کرتا ہے پھر اُجرت کا ایک حصہ تو روزانہ وصول کرتا ہے۔ ایک حصہ ہفتہ وار وصول کرتا ہے اور ایک متعین مقدار ماہ بماہ اور سال بہ سال وصول کرنے کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔ یعنی مطالب و معانی قرآن کے کئی درجے ہیں۔ کچھ سرسری توجہ چاہتے ہیں۔ کچھ ذرا گہرے التفات کے متقاضی ہیں۔ اور کچھ ایسے ہیں کہ پورے پورے استغراق کے طالب ہیں۔

تفہم سے یہ مقصود ہے کہ قرآن کے مطالب و معانی پر اس انداز سے غور کرے کہ ہر ہر مضمون کے مقابلہ میں صرف اُسی رائے اور نقطہ نظر کو اپنائے کہ جو صحیح ہو اور اس مضمون اور مقام کے شایانِ شان ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن میں کئی اہم مضامین کا ذکر ملتا ہے۔ اس میں اللہ کی صفات کی وضاحت بھی ہے اور اس کے افعال و سنن کی تشریح بھی۔ انبیاء علیہم السلام کے احوال و سوانح کا تذکرہ بھی ہے۔ اور مکذبین کی حالت کا بیان بھی۔ پھر اس میں اوامر و نواہی کی تفصیلات بھی مذکور ہیں اور جنت و دوزخ کا نقشہ بھی۔ ظاہر ہے کہ ان سب مضامین میں ایک متعین رائے اور عقیدہ ہی نجات اُخروی کا باعث اور ارتقاء مدارج کا سبب ہوسکتا ہے۔ مثلاً وہ آیات کہ جنہیں اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کا تذکرہ ہے۔ جن میں اس کا سمیع بصیر، قدوس، عزیز، جبار اور متکبر ہونا مذکور ہے۔ ان سب میں قاری کو صحیح اور انسب رائے قائم کرنا چاہئے۔ اور ان اسماء و صفات کی تہوں میں جو غوامض پنہاں ہیں ان کو معلوم کرنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ عبداللہ بن مسعود کا ارشاد ہے:

من اراد علم الاولین والآخرین فلیثور القرآن واعظم علوم القرآن تحت اسماء اللہ عزوجل وصفاتہ۔

جو شخص پہلوں اور پچھلوں کے علوم حاصل کرنا چاہتا ہے اسے قرآن کے معانی میں تدبر کرنا چاہئے۔ اور علوم قرآن کا عظیم ترین ذخیرہ اسماء صفات کے اسرار میں پوشیدہ ہے۔

اللہ تعالےٰ کے افعال وسنن میں غور وفکر کا نہج یہ ہے۔ کہ اس کی ہر ہر مخلوق اور اس کے ہر ہر فعل میں فاعل و صانع ہی کی عظمت کی طرف توجہ مبذول ہو۔ مزید براں قاری یہ سمجھے کہ ہر ہر شئے اسی کی توجہات خلق سے معرض وجود میں آئی ہے۔ اسی کی مرضی وارادے سے قائم وزندہ ہے۔ اور بالآخر اسی کے حکم وفیصلے سے اُسے فنا کے گھاٹ اُترنا ہے۔ خود اپنی ذات کے بارہ میں یہی رائے رکھے کہ اس کا وجود بالتبع بالاستقلال نہیں اگر اللہ تعالےٰ نہ چاہے تو خود اس کی عقل ودانش اس کو ایک لمحہ بھی زندہ نہیں رکھ سکتے۔

اسی طرح جب ایسی آیات کی تلاوت کرے کہ جنمیں انسان کی پیدائش کا ذکر ہے تو ان میں مذکورہ ان تمام عجائب وغرائب پر ایک دقیق نظر ڈالے کہ کیونکر اللہ تعالےٰ نے اس کو ایک قطرہ آب سے گوشت پوست میں بدلا، کس طرح اس میں سمع وبصر کی صلاحیتیں پیدا کیں۔ اور پھر کس طرح اس میں عقل وشعور نے انگڑائی لی۔ لیکن ان تمام انعامات کے مقابلہ میں اس کا طرز عمل یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کے حکموں کو آسانی سے ماننا والا نہیں۔

او لم یر الانسان انا خلقناہ من نطفۃ

فاذا ھو خصیم مبین۔

انبیاء علیہم السلام کے احوال وسوانح کا مطالعہ کرتے وقت اس نکتہ کا استحضار ضروری ہے کہ قاری یہ دیکھے کہ ان کی جلالت قدر اور محبوبیت کے باوجود مخالفت ہوئی، لڑائیاں ہوئیں۔ اور ان میں کے بعض جام شہادت تک پینے پر مجبور ہوئے۔ اس سے اللہ تعالےٰ کی بے نیازی کا سبق حاصل کرنا چاہئے۔ کہ باوجود اس گہرے اور مشفقانہ تعلق و رشتہ کے جو اس کو انبیاء اور اپنی مخلوق سے ہے وہ ان دونوں کی ان آزمائشوں میں کچھ پرواہ نہیں کرتا۔ پھر جب یہ دیکھے کہ آخر آخر ان امتحانات کے بعد انبیاء علیہم السلام اپنے مقصد میں کامیاب ہوکر رہتے ہیں تو اس سے اس کے اس یقین میں اضافہ ہونا چاہئے کہ اللہ تعالےٰ نے حق کی نصرت واعانت کو بہر حال اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔

قرآن میں مکذبین کا بیان بھی ہے۔ جب قاری ان کے احوال وکیفیات پر غور کرے تو دل میں خوف وخشیت کے جذبات کو محسوس کرے کہ مبادا اس کی غفلت وسہو یا سوء ادب ونافرمانی سے اللہ تعالےٰ کا غصہ بھڑک اُٹھے اور یہ بھی اس کے عذاب کا شکار ہوجائے۔ اسی طرح جنت ودوزخ کے قصہ سے عبرت پذیری ضروری ہے۔

قرآن حکیم کے یہ موٹے موٹے اور بنیادی موضوع ہیں۔ ان کا ذکر استقصاء کی نیت سے نہیں کیا گیا۔ بلکہ اس نیت سے کیا گیا ہے کہ قاری کو تفہم سے بے نیاز ہوکر قرآن کا مطالعہ نہیں کرنا چاہئے۔ اور غور وفکر کے مقامات سے یوں ہی بغیر کچھ دامن میں ڈالے اور جھولی میں رکھے نہیں گزر جانا چاہئے۔ بلکہ ہر ہر موضوع اور مضمون کے شایان شان استفادہ کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ ورنہ جہاں تک اس کے مضامین رنگا رنگ کی وسعتوں کا تعلق ہے اس کا احاطہ کس نے کیا ہے؟

قل لوکان البحر مدادا لکلمات ربی
لنفد البحر قبل ان تنفد کلمات ربی
ولوجئنا بمثله مددا۔

غرض یہ ہے کہ کسی نہ کسی حد تک انسان کو تفہیم و ادراک سے کام لینا چاہیئے۔ ورنہ خطرہ ہے کہ قرآن کی اصطلاح میں شمار ان کا محرومانِ قسمت اور تہی دامانِ نصیب لوگوں میں نہ ہو کہ جن کے بارہ میں کہا گیا ہے:

ومنھم من یستمع الیک حتیٰ اذا خرجوا
من عندک قالوا للذین اوتوا العلم ماذا
قال آنفا اولئک الذین طبع اللہ علیٰ
قلوبھم۔

یہاں تک تو ان مثبت تقاضوں کا تعلق تھا جن کا پورا کرنا قاری کے لئے ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں کچھ موانع بھی ہیں۔ کہ جو فہم قرآن کی راہ میں سخت رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ ان سے دست کشی لازم ہے۔ غور و فکر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ چار ہیں۔ بقیہ پہلوؤں کی تفصیل سے پہلے لگے ہاتھوں ان پر بھی نظر ڈالتے چلیئے:

(۱) قرائت و تجوید میں غلو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ:

بعض قراء کی ساری کوششیں صرف اس بات پر مرکوز رہتی ہیں کہ کسی طرح حروف کی تحقیق و ادا کے فرض سے کماحقہ عہدہ برآ ہوں۔ ان کی توجہ چونکہ تمام تر الفاظ و حروف ہی کے مخارج کی طرف مبذول رہتی ہے۔ اور یہ اسی چیز کے درپے رہتے ہیں کہ حلق کے اونچ اور آواز کے زیر و بم کو کیونکر موسیقی میں بدلا جا سکتا ہے اس لئے معانی کا انکشاف ان پر کمتر ہی ہو پاتا ہے۔ اس شخص کی مثال ایسے دیوانے کی سی ہے کہ جو برتن کو خوب دھوتا اور مانجھتا ہے۔ مگر اس میں جو غذا اور کھانا ہے اس سے اپنی گرسنگی دور کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔

(۲) تقلید۔ جب کوئی شخص بغیر ذاتی بصیرت اور مشاہدے کے بعض افکار و مسموعات کی حقانیت پر یقین رکھتا ہے اور ان پر بُری طرح جم جاتا ہے۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں ایک نوع کی تنگ نظری اور تعصب ابھر آتا ہے۔ اور وہ اس لائق نہیں رہتا کہ حقائق قرآنی تک رسائی حاصل کر سکے۔ کیونکہ یہ چیز تقلید سے حاصل ہونے والی نہیں۔ اس کی نفسیات کچھ اس ڈھنگ کی ہو جاتی ہیں کہ ہر ہر بات کو اپنے ہی آباؤ اجداد کے معیار پر جانچ کر دیکھتا ہے اور نفس مسئلہ پر غور نہیں کر پاتا۔ ظاہر ہے کہ اس حالت میں قرآن اس کی رہنمائی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ قرآن تو ذاتی بصیرت و مشاہدے کی دعوت دیتا ہے اور ایسے حقائق و معارف کی طرف بلاتا ہے کہ جو فکر و عقل کی کاوش اور جد و جہد کے متقاضی ہیں۔
یہی مطلب ہے صوفیاء کے اس قول کا:

ان العلم حجاب۔ علم بھی ایک پردہ ہے۔

یعنی ایسا علم جو تقلید سے حاصل ہو اور جو جدلیات و مناظرہ کا نتیجہ ہو حقیقی اور سچا علم نہیں کہ اس سے بڑھ کر کشفِ حقائق کا موجب اور کون ہو سکتا ہے۔

تقلید کی دو صورتیں ہیں اور دونوں غلط ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا تعلق غیر صحیح عقیدہ سے ہو مثلاً ایک شخص کو استواء علی العرش کے معنیٰ یہی باور کرائے گئے ہیں کہ اس سے مراد جسمانی تمکن و استقرار ہے اور اللہ تعالیٰ عرش پر اسی طرح متمکن ہے جس طرح ایک انسان تخت پر بیٹھتا ہے۔ تو اس کے سامنے ہزار تنزیہ کی آیات پیش کیجئے یہ تو ان سے از راہِ تقلید متاثر نہیں ہوگا اور اُسی پہلے عقیدہ پر قائم رہے گا۔

دوسرے یہ کہ اس کا تعلق ایک صحیح عقیدہ سے ہو۔ اس میں یہ قباحت ہے کہ چونکہ اس کا علم تقلیدی ہے، تحقیقی نہیں اس لئے اس مسئلہ کے دوسرے باریک اور نازک پہلو اس کی نظروں سے اوجھل رہیں گے۔ اور وہ یہ نہیں سمجھ پائے گا کہ علم کے کئی درجے ہیں۔ یعنی علم کبھی کسی مسئلہ کے صرف ظواہر ہی سے متعرض ہوتا ہے۔ اور کبھی اس کے باطن کو گھیر لینے کی جدوجہد کرتا ہے۔ اور مقلد نے چونکہ صرف ظاہری رخ کی جھلک ہی دیکھی ہے۔ اور اس پر مطمئن ہو بیٹھتا ہے اس لئے بالطبع اس کے لئے باطنی اسرار تک پہنچنا دشوار ہے۔

(۳) ہجوم شہوات۔ معانی قرآن کے فہم و تدبر میں ایک بہت بڑا مانع بدعملی بھی ہے۔ جب کوئی شخص گناہوں پر اصرار کرے، کبر و غرور کو اپنائے اور معصیت کے ارتکاب پر اترائے اور اصرار کرے، تو اس پر قرآن فہمی کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ شہوات اور ہوائے نفس کی پیروی سے آئینہ قلب زنگار آلود ہو جاتا ہے اور اس قابل نہیں رہتا کہ اس پر قرآن کے معانی و مطالب منعکس ہو سکیں۔ حدیث میں ہے:

اذا عظمت امتی الدینار والدرھم نزع منھا ھیبۃ الاسلام واذا ترکوا الامر بالمعروف والنھی عن المنکر حرموا برکات الوحی۔

جب میری اُمت نے درہم و دینار کو زیادہ اہمیت دینا شروع کی، ان کے دلوں سے اسلام کی ہیبت نکل گئی۔ اور جب اس نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض سے منہ موڑا، وحی کی برکتوں سے محروم ہو گئی۔

حضرت فضیل کا کہنا ہے کہ وحی کی برکتوں سے محروم ہونے کے معنی فہم قرآن سے محروم ہونے کے ہیں۔ نیکی اور قلب کی صلاحیتوں کو فہم قرآن میں دخل ہے۔ اس پر خود قرآن نے جابجا روشنی ڈالی ہے:

تبصرۃ وذکریٰ لکل عبد منیب۔

وما یتذکر الا من ینیب۔

انما یتذکر اولوا الالباب۔

عقل و دانش کے بارہ میں یہ بات سمجھ لینے کی ہے کہ اس سے مراد وہ صلاحیتیں نہیں ہیں کہ جن کی بنا پر کوئی شخص

مزخرفات دنیا کو حاصل کرنے کی تگ ودو کرتا ہے۔ بلکہ اس سے مقصود وہ بصیرت ہے۔ کہ جس کے سبب دنیا کے مقابلہ میں آخرت وعقبیٰ کی قدر وقیمت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔

(۴) تفسیر ظاہری پر انحصار۔ قرآن کی تعبیر وتفسیر کے کئی پہلو ہیں۔ اس لئے جو شخص یہ سمجھتا ہے۔ کہ تفسیر کا وہی حصہ مستند اور صحیح ہے جو ظواہر الفاظ سے متعلق ہے۔ اور جو ابن عباس، مجاہد یا عکرمہ وغیرہ سے منقول ہے۔ اور اس کے باطنی اور روحانی پہلو در خور اعتنا نہیں تو یقین رکھئے کہ ایسا شخص قرآن کے اسرار و معارف سے یکسر محروم ہے۔ اور یہ خیال بھی منجملہ ان حجابات کے ہے کہ جو فہم قرآن کے سلسلہ میں حائل ہوتا ہے۔

تفہیم کا ایک مرتبہ یہ ہے کہ قرآن پڑھنے والا ہر ہر حکم اور ہر ہر آیت کا مخاطب اپنی ذات کو قرار دے اسے تخصیص کہتے ہیں یعنی جب کسی امر کے بارہ میں پڑھے تو اس کا داعیہ عمل بیدار ہو۔ جب نہی پر مشتمل آیات کا مطالعہ کرے تو گناہوں سے نفرت کے جذبات بیدار ہوں۔ اسی طرح انبیاء کے قصص واحوال کی تلاوت کرے تو ان میں تذکیر واعتبار کے پہلوؤں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے اور یہ نہ سمجھے کہ اللہ نے ان کو محض بطور کہانی کے بیان کیا ہے۔ اسی کیفیت تفہیم کو قرآن نے تثبت سے تعبیر فرمایا ہے:

ما نثبت به فوادك۔

غرض یہ ہے کہ نزول قرآن کا سبب یہ قرار دے کہ بغیر کسی استثناء کے اس کے مخاطب تمام افراد اور تمام بنی نوع انسان ہیں۔ اور ان میں کی ہر ایک کی اصلاح مقصود ومطلوب ہے۔

واذکروا نعمت اللہ علیکم وما انزل علیکم
من الکتاب والحکمة یعظکم به۔
لقد انزلنا الیکم کتابا فیه ذکرکم افلا تعقلون۔
هٰذا بصائر للناس وهدیٰ ورحمة
لقوم یوقنون۔

اسی حقیقت کو محمد بن کعب القرضی کی چشم بصیرت نے بھانپا اور ان الفاظ میں بیان کیا:

من بلغه القرآن فکانما اللہ کلمه۔ جس تک قرآن پہنچا اس سے گویا اللہ نے بات چیت کی۔

اور اسی نکتہ دلنواز کی طرف مالک بن دینار نے ایک سوال پوچھ کر توجہ دلائی:

ماذرع فی قلوبکم یا اهل القرآن ربیع المومن۔ اے عشاق قرآن یہ تو بتاؤ کہ تمہارے دلوں میں قرآن نے کیا گل بوئے پیدا کئے یاد رکھو کہ قرآن مومن کے لئے موسم بہار کی مانند ہے۔

یعنی جس طرح بہار کے زمانے میں زمین مردہ بھی زندہ ہو جاتی ہے اور اس میں روئیدگی کی مخفی صلاحیتیں جاگ اٹھتی

ہیں۔ اسی طرح قرآن کی برکت سے تمہارے دلوں کی زمین کو بھی رشکِ گلستاں ہونا چاہیئے۔ اور اس میں بھی ایمان کے برگ وبار پر نکھار آنا چاہیئے۔ کیا اس سے یہ مقصد حاصل ہوا؟ اور اس کی تلاوت سے تم نے اپنے دلوں میں کوئی اثر محسوس کیا؟

تاثر سے یہ مطلب ہے کہ قاری مختلف مضامین کی آیات سے قلب و ذہن میں ایسی کیفیات پیدا کرے اور اکسائے جو ان مضامین کے عین مطابق ہوں۔ اور پھر صرف کیفیات ہی پیدا نہ کرے بلکہ ان کے نتیجے میں وجد و حال کے جذبات کو طاری کرنے کی جد و جہد کرے۔ یعنی اگر آیات خوف و خشیت اور حزن و غم کے اسباب پر مشتمل ہوں تو جسم پر رعشہ اور کپکپی کے آثار نمودار ہونے چاہئیں اور اگر مغفرت اور بخشش کے وعدوں کے تذکرے ہوں تو سارے جسم میں سرور و انبساط کی لہر دوڑ جانا چاہیئے۔ اور ایسا محسوس ہونا چاہیئے کہ قاری نے فی الواقع مسرت و ابتہاج کے دواعی کو محسوس کیا ہے۔ اور اس کو اللہ تعالیٰ کے ان وعدوں کا پورا پورا یقین ہے ـــــ لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے، کہ قرآن سے جس درجہ شغف بڑھے گا اور اس کے معارف و مضامین سے جس درجہ واقفیت زیادہ گہری ہوتی جائے گی اسی نسبت سے خوشی اور مسرّت کے بجائے غم و حزن کی کیفیات سے دل زیادہ متاثر ہوگا۔ کیونکہ اس کتاب ہدیٰ میں ایسی آیات کی کثرت ہے کہ جن سے گداز، رقّت اور سوز کے احوال پیدا ہوتے ہیں۔ اور کہیں کہیں اگر مغفرت و بخشش کی خوشخبریاں سنائی بھی گئی ہیں۔ تو ایسی کڑی شرائط کے ساتھ کہ جن کا ایفا آسان نہیں۔ مثلاً سورۂ العصر میں انسان کی محرومیوں کے بارہ میں یہ بتایا گیا۔ کہ یہ جد و جہد اور تگ و دو کے باوجود بالعموم خسارے اور گھاٹے کی زندگی ہی بسر کرتا ہے اور اس کے اعمال کا رُخ عموماً ہلاکت و بربادی کی طرف رہتا ہے۔ ہاں اس چکّر سے اس کا مخلصی حاصل کر لینا بھی ممکن ہے۔ مگر کیونکر؟ اور کن لوگوں کے لئے؟

الا الذین آمنوا وعملوا الصالحات وتواصوا
بالحق وتواصوا بالصبر۔

گویا ایمان، عمل صالح اور تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کی چار چار شرطوں کو اس غرض کے لئے پورا کرنا ضروری ہے۔ ان پر غور کیجئے اور بتائیے کہ کیا ان سے نمٹنا آسان ہے؟ اور یہ خوشخبری ایسی ہے کہ بغیر سخت شدائد و محن سے گذرے اس سے کون شخص بہرہ مند ہو سکے۔

اس تاثر کے بارہ میں حسن بصری نے فرمایا:

واللہ ما اصبح الیوم عبد یتلوا القرآن یومن بہ الا کثر حزنہ وقل فرحہ وکثر بکاءہ وقل ضحکہ وکثر نصبہ و

بخدا جس روز بھی کسی شخص نے قرآن کی تلاوت کی، اس کا حزن بڑھ گیا اور اس کی خوشیاں کم ہوگئیں، اس کے نالہ و شیون میں اضافہ ہوا اور ہنسی ختم ہوگئی، اس کی تگ و دو اور سعی و کوشش کے دائرے

شغله وقلت راحته وبطالته۔ وسیع ہوئے اور راحت و بطالت جاتی رہی، بشرطیکہ یہ شخص اس قرآن پر ایمان بھی رکھتا ہو۔

یہی وہ تاثر تھا کہ جس کی وجہ سے کچھ اہل اللہ قرآن پڑھتے وقت غش کھا کر گر پڑتے، اور اسی تاثر کا یہ کرشمہ ہے کہ کچھ اہل دل حضرات سے متعلق ہم سنتے اور پڑھتے ہیں کہ تلاوت کے دوران ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ اور اگر یہ تاثر پیدا نہ ہو اور قرآن پڑھتے وقت رقت و گداز کی کیفیات طاری نہ ہوں تو پھر قاری کی حیثیت اس سے زیادہ کیا ہے کہ وہ صرف حقائق و واقعات کی حکایت کرنے والا ہے۔ بلکہ ان حقائق و واقعات کو جھٹلانے والا ہے۔ مثلاً جب وہ کہے گا:

انی اخاف ان عصیت ربی عذاب یوم عظیم۔

اور اس کے دل کا یہ حال ہے کہ خوف و حزن کا ادنیٰ شائبہ بھی پایا نہیں جاتا۔ تو یہی آیت پکار کر کہے گی جھوٹ بکتا ہے۔

اسی طرح جب کہے گا:

علیک توکلنا والیک انبنا والیک المصیر۔

اور اس کی حالت سے توکل و انابت کا اظہار نہیں ہو پاتا۔ تو یہی آیت اس کے جھوٹ پر سب سے بڑی دلیل ہوگی۔

غرض قرآن تو اس لئے پڑھا جانا چاہئے کہ اس سے یہ کیفیات پیدا ہوں اور یہ احوال و مواجید نمودار ہوں اور اگر اس سے ادنیٰ تاثر پیدا نہیں ہوتا اور قلب و ذہن کسی تبدیلی کو محسوس نہیں کرتا۔ تو یہ تلاوت نہ ہوئی صرف زبان ہلانا ہوا جو کچھ بھی تو مشکل نہیں۔ اس سلسلہ میں اہل اللہ کیا سمجھتے ہیں اس کا اندازہ اس قصہ سے لگائیے۔

ایک قاری کا کہنا ہے کہ میں نے ایک مشہور اور خدا رسیدہ عارف سے قرآن کی چند آیات پڑھیں۔ پھر جب دوبارہ ان کی خدمت میں اعادہ و تکرار کی نیت سے حاضر ہوا تو انہوں نے ڈانٹا۔

جعلت القرآن علیٰ عملاً اذھب فاقرأ علی اللہ عزّ وجل۔ تم نے قرآن کو بھی کوئی دنیاوی کام سمجھ رکھا ہے کہ اس میں صنعت و کمال پیدا کرنا خوبی ہو۔ جاؤ جو پڑھا ہے اس کو اللہ تعالیٰ کے روبرو پیش کرو اور اپنا محاسبہ کرو۔

صحابہ کا نقطہ نظر بھی تلاوت و حفظ کے بارہ میں یہی تھا کہ وہ محض عمل کی نیت سے پڑھتے۔ اور اپنی زندگیوں کو اس کے مطابق ڈھالنے کی غرض سے یاد کرتے۔ ترتیل و تجوید کے وضعی قاعدوں میں کمال پیدا کرنا ان کا مقصود نہ تھا۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ جب حضور کا انتقال ہوا ہے اس وقت بیس ہزار صحابہ میں سے جن کو پورا قرآن یاد تھا ان کی تعداد چھ سے زیادہ نہ تھی۔ باقی تمام وہ حضرات تھے جن کو ایک آدھ سورۃ ہی یاد تھی۔ یا ان کے بعض حصے ازبر تھے۔ کیوں؟ اس لئے

نہیں کہ ان کا حافظہ خدانخواستہ قوی نہ تھا یا ان میں حفظ و تثبت کی صلاحیتیں پائی نہیں جاتی تھیں۔ اس لئے اور محض اس لئے کہ یہ جتنا بھی پڑھتے تھے۔ اس کی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے تھے۔ اور اس پر عمل کرنا ضروری جانتے تھے۔ چنانچہ ایک صحابی کا قصہ ہے کہ یہ آنحضرت کی خدمت میں قرآن پڑھنے کی غرض سے حاضر ہوئے۔ جب اس آیت تک پہنچے:

فمن یعمل مثقال ذرۃ خیراً یرہ ومن یعمل
مثقال ذرۃ شراً یرہ۔

تو کہنے لگے:

یکفنی ھذا۔ کہ جناب میری عملی زندگی کے لئے یہی بہت ہے۔

یہ کہا اور پلٹے۔ اس پر آنحضرت نے فرمایا:

انصرف الرجل وھو فقیہ۔ کہ پلٹ کر جانے والا قرآن کے اصلی راز کو پا گیا ہے

اس میں شبہ نہیں کہ تاثر کی یہ کیفیت آسانی سے پیدا ہونے والی نہیں۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ یہی تلاوت سے مقصود بھی ہے اور اس کے بغیر اس کی لذتوں سے انسان دوچار ہو ہی نہیں سکتا۔ یہی نہیں بلکہ تلاوت کا سرے سے صرف زبان ہلا دینے پر اطلاق ہی نہیں ہوتا۔ تلاوت کہتے ہیں اس چیز کو کہ اس میں زبان، عقل اور قلب تینوں کا برابر کا حصہ ہو۔ عقل معانی پر غور کرے اور قلب تاثر کی نعمتوں سے مالا مال ہو۔

قاری کا ایک مقام ترقی کہلاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قاری یہ محسوس کرے کہ وہ کلام الٰہی کو اپنی زبان سے نہیں سن رہا، بلکہ براہ راست اللہ تعالیٰ کی زبان سے سن رہا ہے۔ اور اس سے شرف تخاطب حاصل کر رہا ہے۔ یوں قرأت کے تین درجے ہیں:

پہلا درجہ یہ ہے کہ اپنے کو اللہ تعالیٰ کے حضور تصور کرے اور یہ سمجھے کہ اس کی نظریں اس کے جمال جہاں آرا کے لطف سے بہرہ مند ہیں۔ اور اس کی توجہ اس کی طرف پوری طرح اس کی ذات گرامی کی طرف مبذول ہے۔ یہ مقام دعا، تضرع اور ابتہال چاہتا ہے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ دل سے اس حقیقت پر ایمان رکھے کہ اس کا آقا و مالک اُسے دیکھ رہا ہے۔ اس سے مخاطب ہے۔ اور اپنی عنائتوں کا تذکرہ کر رہا ہے۔ یہ مقام حیا، تعظیم اور توجہ و فہم کا طالب ہے۔

تیسرا درجہ ان دونوں سے بلند ہے۔ اس کا یہ تقاضا ہے کہ قاری آیات و کلمات میں اللہ تعالیٰ کے جلووں کو ملاحظہ کرے اور اس کی صفات کی کرشمہ سازیوں اور کارفرمائیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ اس وقت اس کے سامنے نہ تو اپنی ذات ہوگی اور نہ اس حیثیت سے اللہ تعالیٰ کے انعامات ہونگے کہ اس نے ان سے کس درجہ فائدہ اٹھایا ہے۔ بلکہ اس وقت توجہ و ہمت کی تمام صلاحیتیں اللہ تعالیٰ کی ذات برتر پر مرکوز ہونگی۔ خیال ہوگا تو اس کا اور فکر و تدبر ہوگا تو اس کے بارے میں۔

گویا پورے پورے استغراق سے کام لیا جائے گا۔ یہ درجہ مقربین کے ساتھ خاص ہے۔ اور اس سے پہلے کے دو درجے اصحاب الیمین کے ساتھ مختص ہیں۔ اس کے علاوہ جو مقامات ہیں ان کو بجز سہو و غفلت کے مقامات کے اور کس مقام و درجہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے؟

پہلے درجہ کے متعلق جعفر بن محمد الصادق کا کہنا ہے:

لقد تجلی اللہ عزوجل فی کلامہ ولکن لا یبصرون۔ — اللہ تعالیٰ اپنے کلام میں متجلی تو ہے مگر یہ لوگ اس کی تجلیات کو دیکھنے کی کوشش نہیں کرتے۔

ایک مرتبہ ایک آیت کی تلاوت کے دوران انہیں غش آگیا۔ سبب پوچھا گیا تو فرمایا:

مادمت اردد الایۃ علی قلبی حتی سمعتھا من المتکلم بھا فلم یثبت جسمی لمعانیۃ قدرتہ۔ — میں بار بار اس آیت کو دہرا رہا تھا تاکہ خود متکلم اور کہنے والے کے منہ سے اس کو سن سکوں، چنانچہ بالآخر اس کوشش میں کامیاب ہوا لیکن اس حال میں کہ جسم اس مشاہدہ کا متحمل نہ ہو سکا۔

یہ وہ مقام ہے کہ جہاں قرأت و تلاوت کی لذتیں بڑھ جاتی ہیں۔ اور انسان قرآن کے صحیح صحیح لطف سے آگاہی حاصل کرتا ہے۔

ایک صاحب دل حکیم کا قول ہے کہ میں نے قرآن پڑھا، مگر اس کی لذتوں سے محروم رہا۔ پھر اس نقطہ نظر سے اس کی تلاوت کی۔ کہ آں حضرت سے گویا براہِ راست سماعت کا فخر حاصل کر رہا ہوں۔ پھر اس مقام سے آگے بڑھا اور جبریل کی زبان فیض ترجمان سے سننے کی کوشش کی۔ اور بالآخر وہ مرحلہ آیا کہ قرآن کے اتارنے والے سے ہمکلامی کی سعادت نصیب ہوئی۔ اور نہ پوچھئے کہ اس مقام کی لذتیں کیا درجہ رکھتی ہیں۔ بس اختصار سے اتنا ہی سمجھ لیجئے

لا اصبر عنہ۔ — کہ یہاں پہنچ کر پھر جدائی کا یارا نہیں رہتا۔

حضرت حذیفہ نے فرمایا:

لو طھرت القلوب لم تشبع من قراءۃ القرآن۔ — اگر دل پاک ہوں تو قرآن سے سیر ہونے کی کبھی نوبت نہ آئے۔

یعنی اس میں کی ہر ہر لذت تشنگی کو اور بڑھاتی ہے اور اگلی لذتوں کی نشان دہی کرتی ہے۔

آخری درجہ تبیری کا ہے۔ اس کا یہ تقاضا ہے کہ قاری اپنی استطاعت اور طاقت کے پندار و زعم سے یکسر علیحدگی اختیار کرے اور رضاء الٰہی اور تزکیہ نفس کو اپنی تمام توجہات کا مدار و مرکز ٹھہرائے چنانچہ جب ایسی آیات کی تلاوت کرے کہ جن میں اللہ تعالیٰ کے وعدے اور خوشخبریاں ہوں۔ تو ان کا مخاطب اپنی ذات کو ہرگز نہ سمجھے بلکہ اُمت کے صلحاء و صدیقین کو ان کا مخاطب صحیح قرار دے۔ اور اس خواہش و آرزو کا اظہار کرے کہ اللہ تعالیٰ اس کو بھی ان لوگوں میں شمار کرے۔ اور ان کے تتبع اور پیروی کی توفیق مرحمت فرمائے۔ اور جب ایسی آیات پر اس کا گزر ہو۔ کہ جن میں اللہ کے غضب و مقت کا تذکرہ ہو۔

اور ان لوگوں کا بیان ہو۔ کہ جنہوں نے دین کے معاملہ میں ہر طرح کے تساہل و کوتاہیوں کو روا رکھا ہے۔ تو اس کا مخاطب اپنی ذات کو سمجھے۔ اور بخشش و عفو میں مصروف ہو۔ یہی وہ عارفانہ گُر ہے جس کی طرف عبداللہ بن عمر نے اپنی ایک دعا میں اشارا کیا:

اللھم استغفرك لظلمی وکفری۔ اے خدا میں اپنے ظلم اور کفر پر معافی کا طالب ہوں۔

پوچھا گیا کہ حضرت ظلم کا اطلاق تو سمجھ میں آسکتا ہے مگر یہ کفر کیسا؟ مسلمان اور کافر؟ فرمایا، کفر کے بھی درجے ہیں۔ کیا یہ آیت نظر سے نہیں گزری:

ان الانسان لظلوم کفار۔

مطبوعاتِ بزمِ اقبال

مجلّہ اقبال۔ مدیر:۔ ایم۔ ایم۔ شریف۔ بشیر احمد ڈار
سہ ماہی اشاعت۔ دو انگریزی۔ دو اردو شماروں میں۔ قیمت سالانہ دس روپے صرف اردو یا انگریزی پانچ روپے

مٹافزکس آف پرشیا۔	مصنّفہ علامہ اقبال	۵—۰—۰
امج آف دی وسٹ ان اقبال۔	مصنّفہ مظہرالدین صدیقی	۲—۰—۰
اقبال اینڈ والنٹرزم۔	مصنّفہ بشیر احمد ڈار	۶—۰—۰
ذکرِ اقبال۔	مصنّفہ مولانا عبدالمجید سالک	۵—۰—۰
اقبال اور ملّا۔	مصنّفہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم	۰—۱۲—۰
مکاتیب اقبال۔	بنام خان محمد نیاز الدین خان مرحوم	۱—۴—۰
تقاریر یومِ اقبال۔	۱۹۵۴ء	۱—۴—۰
علامہ اقبال۔	مترجمہ صوفی غلام مصطفےٰ تبسّم	۱—۸—۰
فکرِ اقبال	ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم	۱۰—۰—۰

سیکرٹری بزمِ اقبال و مجلس ترقی ادب۔ نرسنگھ داس گارڈن۔ لاہور